اگر ہم آپ کے اِس استدلال کو مان لیں کہ قرآن میں چونکہ حکم ہے کہ جب تم نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو، اس لیے ہر نماز کے لیے تازہ وضو ضروری ہے، تو اسی طرح کا استدلال کر کے ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر مستطیع مسلمان کو ہر سال حج کے موقع پر حج کرنا چاہیے اور اس کے برعکس ایک دوسرا شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک مرتبہ زکوٰۃ دے دینے سے حکم زکوٰۃ کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ تشریح رسول سے بے نیاز ہو کر ہر شخص قرآن کی ہر آیت کی ایک الگ تاویل و تعبیر کر سکتا ہے اور کسی ایک شخص کی رائے دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں بن سکتی۔ (وضو اور نواقض وضو کے بارے میں ایک سوال کا جواب میری مطبوعہ کتاب "رسائل و مسائل" میں تفہیمات کے عنوان کے تحت بھی دیا گیا ہے، آپ اسے بھی ملاحظہ فرمالیں)

قصر کے متعلق سوال کرنے میں بھی آپ وہی غلطی کر رہے ہیں جو وضو کے معاملے میں آپ نے کی ہے۔ قرآن کے منشا کی تعیین میں قرآن لانے والے رسول کی توضیح و تشریح کو نظر انداز کرنا ایک بہت بڑی اصولی غلطی ہے جس کی بے شمار قباحتوں میں سے چند کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ قرآن صرف حالتِ خوف میں قصر کی صورت بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس حالت میں صرف ایک رکعت بھی کفایت کر سکتی ہے۔ اس حکم میں کہیں بھی حالتِ امن کے قصر کی نفی موجود نہیں ہے۔ یہ دوسری قسم کا حکم قصر ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہنچا ہے اور وہ یہ ہے کہ عام سفر میں صبح اور مغرب کی نمازیں پوری پڑھی جائیں اور صرف چار رکعت والی نمازوں کو کم کر کے دو دو رکعت کر دیا جائے۔ اِس قصر کو جو شخص خلافِ قرآن کہتا ہے وہ دو بڑی غلطیاں کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کسی چیز کے قرآن میں نہ ہونے اور اُس کے خلافِ قرآن ہونے کو ہم معنی سمجھتا ہے حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ نبیؐ کے واسطے کو درمیان سے ہٹا کر براہِ راست قرآن کو لینا چاہتا ہے، حالانکہ خدا نے قرآن نبی کے واسطے سے بھیجا تھا۔ کیا وہ شخص یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا نے یہ واسطہ درمیان میں رکھ کر ایک فضول کام کیا ہے؟ ہم اس واسطے کے بغیر خود ہی قرآن سمجھ سکتے تھے۔

دُعا میں بزرگوں کی حُرمت وجاہ سے توسّل

سوال:- مَیں نے ایک مرتبہ دریافت کیا تھا کہ بجاہ فلاں یا بحرمت فلاں کہہ کر خدا سے دعا کرنے

کا کوئی شرعی ثبوت ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا تھا کہ اگرچہ اہلِ تصوف کے ہاں یہ ایک عام معمول ہے لیکن قرآن و حدیث میں اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکی ہیں اس سلسلے میں ایک آیت قرآنی اور ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔ سورۂ بقرہ میں اہلِ کتاب کے بارے میں آیا ہے وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا یعنی بعثت محمدی سے پہلے یہودی کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے اس کی تفسیر میں امام راغب نے مفردات میں فرمایا ہے ای لیستنصرون اللہ ببعثة محمد (یعنی بعثت محمدی کے ذریعہ اللہ سے مدد مانگتے تھے) وقیل کانوا یقولون انا لننصر بمحمد علیہ السلام علی عبدة الاوثان (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہودی یوں کہتے تھے کہ ہم کو بت پرستوں کے مقابلے میں محمد علیہ السلام کے ذریعہ سے نصرت بخشی جائے گی) وَقِيلَ يطلبون من اللہِ بذکرہ الظفر (اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے ذکر کے ذریعہ اللہ سے فتح مانگتے تھے)

ترمذی شریف کے ابواب الدعوات میں ایک حسن صحیح غریب حدیث مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ میری تکلیف کو دور کر دے۔ آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں دعا کروں اور اگر صبر کر سکتے ہو تو صبر کرو، صبر تمہارے لیے بہتر ہے۔ اُس نے عرض کیا آپ دعا فرمائیں۔ آپ نے اُسے اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا اور یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی اللھم انی اسئلك واتوجہ الیك بنبیك محمد نبی الرحمة۔ انی توجھت بك الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی۔ اللھم فشفعه فیَّ۔ (خدایا! میں تیرے نبی محمد نبی رحمت کے ذریعہ سے تجھ سے دعا کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں میں نے اپنی اس حاجت کے لیے اسے پروردگار تیری طرف توجہ کی ہے تاکہ تو میری حاجت پوری کرے۔ پس اے اللہ میرے حق میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت قبول فرما)۔ کیا اس آیت اور اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ دعا میں بحرمت سید المرسلین یا بجاہ نبی، بطفیل نبی یا ببرکت حضور کہنا صحیح اور جائز ہے؟

جواب - آیت مذکورہ کا یہ مطلب میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل آپ کے توسل سے کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب وہ ہے

جو امام راغبؒ کے پہلے دو اقوال سے بھی نکلتا ہے اور جس کی تائید معتبر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے یہودی اُن پیشینگوئیوں کی بنا پر جو آپؐ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں، یہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ نبی آئے اور پھر اُس کی بدولت ہمیں کفار پر غلبہ حاصل ہو۔ چنانچہ ابنِ ہشام کی روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر جب پہلی مرتبہ مدینہ کے چند لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی اور آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو وہ آپس میں کہنے لگے یَا قَوْمِ تَعْلَمُوا وَاللّٰهِ اَنَّهُ لَلنَّبِیُّ الَّذِی تَوْعَدُکُمْ بِهِ الْیَهُوْدُ فَلَا تَسْبِقَنَّکُمْ اِلَیْهِ (ج ۲ ص ۳۸) "لوگو! جان لو کہ بخدا یہ وہی نبی ہے جس کی آمد کا خوف تم کو یہودی دلایا کرتے تھے۔ پس ایسا نہ ہونے پائے کہ تم سے پہلے وہ اس کے پاس پہنچ جائیں"۔ پھر آگے چل کر ابن ہشام اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے انصارِ مدینہ کے بڑے بوڑھوں کا یہ قول نقل کرتے ہیں فِیْنَا وَاللّٰهِ وَفِیْهِمْ نزلت هذه القصة۔ کنا قد علوناهم ظهرًا فی الجاهلیة ونحن اهل الشرك وهم اهل کتاب۔ فکانوا یقولون لنا ان نبیًّا یبعث الآن نتبعه قد اظل زمانه۔ نقتلکم معه قتل عاد وارم۔ فلما بعث اللّٰه رسوله صلی اللّٰه علیه وسلم من قریش فاتبعناه وکفروا به "یعنی یہ آیت ہمارے اور یہودیوں کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ جاہلیت میں ہم ان پر غالب ہوگئے تھے اور ہم اہلِ شرک تھے۔ پس وہ ہم سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کی آمد کا وقت آپہنچا ہے ہم اس کی قیادت میں تم کو اس طرح ماریں گے جیسے عاد و ارم مارے گئے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش سے مبعوث کیا تو ہم نے آپ کی پیروی اختیار کرلی اور انہوں نے آپ کا انکار کر دیا"۔

رہی جامع ترمذی کی وہ حدیث جو آپؐ نے نقل فرمائی ہے تو اس کا مضمون تو آپ ہی بتا رہا ہے کہ استدعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی تھی کہ آپ دعا فرمائیں اور آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ اچھا تو اللہ سے دعا کر کہ "خدایا میں تیرے نبی کے واسطے سے تیرے حضور اپنی حاجت لے کر آیا ہوں۔ تو میرے حق میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش قبول کر"۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کے حق میں دعا فرمائی اور اس سے بھی فرمایا کہ میرے واسطے سے تو بھی اپنی حاجت طلب کر اور میری سفارش قبول کیے جانے کی بھی دعا مانگ۔ یہ تو دعا کی بالکل ایک فطری صورت ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے

(باقی صفحہ ۳۶ پر)